از خلافت تا امارت

امت مسلمہ کے لئے واجب القبول نظام

(۴)

بعض مشوروں کا پس منظر

مثلاً غزوۂ بدر کے سلسلہ میں آپؐ نے حضرات صحابہؓ سے مشورہ لیا۔ خود ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے اس سلسلہ میں لکھا ہے کہ:۔

"انصار سے یہ بات طے ہوئی تھی کہ آپؐ ان کو کسی معرکہ میں نہ لیجائینگے۔ ہاں اگر آپ پر کوئی افتاد آپڑے تو اس کے دفاع اور مقابلہ میں آپ کے ساتھ ضرور تعاون کرینگے۔"

کیا اس صورت میں آپ ان کو بدر کے غزوہ میں شرکت کا حکم دے سکتے تھے؟ غزوۂ بدر سے پہلے کچھ غزوات وسرایا ہوئے غزوات کی سربراہی چونکہ آپؐ نے خود فرمائی اس لئے آپ نے مدینہ میں اپنی نیابت کا جلیل القدر منصب انصاری صحابیوں کے سپرد فرمایا۔ چنانچہ غزوہ ودّان کے موقعہ پر حضرت سعد بن عبادہ انصاری، اور غزوۂ بواط کے موقعہ پر حضرت سعد بن معاذ انصاری کو اور غزوۃ العشیر کے وقت حضرت ابوسلمہ بن عبدالاسد کو نائب حکومت بنایا گیا۔[۱] یہ تینوں حضرات اپنی اپنی برادریوں کے سردار اور معززین تھے۔

---

[۱] اسلام کا نظام حکومت بحوالہ صفحہ ۵۰۲ تاریخ الکامل لابن اثیر صفحہ ۴۲ جلد ۲

بظاہر آپ نے یہ انصار کے تالیف قلب کے لئے کیا ہوگا۔ لیکن ان غزوات کے علاوہ جو سرایا آپ نے بھیجے۔ ان کی سربراہی تالیف قلب کے لئے بھی کسی انصاری صحابی کے حوالے نہیں کی۔ بلکہ وہ مسلح ٹولیاں آپ نے مہاجر صحابہ کی زیر سرکردگی بھیجیں، چنانچہ سریہ سیف البحر کے سالار حضرت حمزہ بن عبدالمطلب اور سریہ رابغ میں حضرت عبیدہ بن الحارث اور سریہ خرار میں حضرت سعد بن ابی وقاص اور سریہ نخلہ میں حضرت عبداللہ بن جحش امیر فوج بنائے گئے [1]۔ اس کی وجہ اس کے سوا کیا ہو سکتی ہے کہ ابھی انصار جدید الاسلام بھی تھے، اور پھر ان سے اقدامی لڑائیوں اور مہموں میں عدم شرکت کا وعدہ تھا

جب بدر کے تاریخی غزوہ کا مرحلہ آیا تو ایک طرف تو آپ نے متعین طور پر یہ نہیں فرمایا کہ ہم لڑائی اور باقاعدہ جنگی مقابلہ آرائی کے لئے جا رہے ہیں۔ بلکہ آپ نے ایک تجارتی قافلہ کی بات کو مقدم رکھا تھا۔ ہاں فوجی مقابلہ آرائی کا امکان بھی ظاہر فرما دیا تھا۔ منشا یہی ہو سکتا ہے کہ فوجی مقابلہ آرائی اور حملہ کی یکطرفہ اور صاف بات سے ایک دم بدک نہ جائیں۔ اور یہی وجہ تھی کہ جب آپ نے مشورہ کیا۔ اور مہاجر صحابہ نے منشائے حضور کی تعمیل کی یقین دہانی کی تو آپ پھر بھی رائے طلب فرماتے رہے، تا آنکہ انصاری صحابہ نے یہ سمجھا کہ غالباً ہم سے براہ راست جواب مطلوب ہے۔ تو ان کے سرداروں نے عرض کیا یا رسول اللہ مدینہ کا ہر فرد تعمیل حکم کے لئے ہر وقت تیار ہے۔ اگر سمندر میں کودنے کا امر ہوا تو اس میں بھی تامل نہ ہوگا۔ اس جواب پر آپ کا چہرۂ مبارک خوشی سے دمک اٹھا اور تیاریاں شروع کر دی گئیں۔

---

[1] رحمۃ للعالمین جلد ۲ ص ۲۳۰ قاضی سلیمان منصور پوری۔

شورائیت اور جمہوریت میں فرق

علاوہ ازیں جس مشورے کی ہدایت اسلام میں موجود ہے اس کا کوئی تعلق موجودہ دور کی جمہوریت سے قطعاً نہیں ہے دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے، اس لئے کہ جمہوریت میں تو کثرت رائے کو قانونی اہمیت حاصل ہے۔ جس بات کے حق میں زیادہ رائے جمع ہو جائیں گی وہ بات واجب العمل ہو جائے گی۔ خود مشورہ لینے والا بھی اس کا پابند ہو جائے گا۔ اور اس کا اپنا کوئی اختیار باقی نہیں رہے گا۔

اس کے برعکس اسلام کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اصل چیز دلیل کی قوت اور بات کی معقولیت ہے۔ خواہ وہ اکثریت کی طرف سے ہو یا ایک فرد کی جانب سے۔ محض کثرت رائے اصل مقصود نہیں ہے۔ علاوہ ازیں عقلاء کی زیادہ تعداد کا کسی ایک بات پر متفق ہو جانا مفید بھی ہو سکتا ہے لیکن عوام جن میں بے علم اور بے عقل لوگوں ہی کی کثرت ہوگی اسی لئے ان کو خواص کے مقابلہ میں عوام کہا جاتا ہے تو ان کی کثرت کیسے ہر جگہ مفید ہو سکتی ہے۔

مطلقاً کثرت رائے کی عدم افادیت

حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحب مدظلہ مہتمم دارالعلوم دیوبند نے اس مسئلہ پر اسلام کی بہترین ترجمانی کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے "زیادہ افراد کا کسی ایک جانب آجانا اسلام میں حق و باطل کے فیصلہ کے لئے کوئی بنیادی حیثیت نہیں رکھتا۔ اس لئے فی نفسہ اکثریت کو اسلامی قانون (قرآن حکیم) نے کوئی بھی وقعت نہ دیتے ہوئے حد درجہ غیر اہم ٹھیرایا ہے اور دین و ملک اور دیانت و سیاست کے تمام ہی دائروں میں نفس اکثریت کی بے وقعتی اور بے اعتباری کھلے لفظوں میں ظاہر کی ہے۔ قرآن حکیم نے ایک سے زائد جگہوں میں فرمایا۔

(۱) واکثرھم لایعقلون — اور ان میں سے اکثر آدمی نہیں سمجھتے۔

(۲) ولکن اکثر الناس لایعلمون — اور لیکن اکثر آدمی علم نہیں رکھتے۔

(۳) ولکن اکثرھم یجھلون — لیکن ان میں زیادہ جہالت کی باتیں کرتے ہیں

(۴) ولکن اکثرھم للحق کارھون — اور ان میں اکثر آدمی حق بات سے نفرت کرتے ہیں۔

(۵) وما یتبع اکثرھم الا ظنا ان الظن لایغنی من الحق شیئا — اور ان میں سے اکثر لوگ صرف بے اصل خیالات پر چل رہے ہیں اور یقیناً بے اصل خیالات امر حق میں ذرا بھی مفید نہیں۔

(۶) قل لایستوی الخبیث والطیب ولو اعجبک کثرۃ الخبیث۔ — آپ فرما دیجئے کہ ناپاک اور پاک برابر نہیں گو تجھکو ناپاک کی کثرت تعجب میں ڈالتی ہے۔

(۷) وان تطع اکثر من فی الارض یضلوک عن سبیل اللہ ان یتبعون الا الظن وان ھم الا یخرصون — اور دنیا میں زیادہ لوگ ایسے ہیں کہ اگر آپ ان کا کہنا ماننے لگیں تو وہ آپ کو اللہ کی راہ سے بے راہ کر دیں اور وہ محض بے اصل خیالات پر چلتے ہیں اور بالکل قیاسی باتیں کرتے ہیں [۱]

مختلف آراء میں حق ترجیح

اسی طرح اسلام نے امیر کو مشورہ کا پابند ضرور بنایا ہے۔ لیکن اختلاف کی صورت میں کسی ایک رائے کو ترجیح دینے کا حق اصول جمہوریت کی طرح مشورہ دینے والی جماعت کو نہیں بلکہ امیر کو دیا ہے۔ اس موقع پر بھی حضرت حکیم الاسلام کی کتاب کا اقتباس زیادہ مفید ہے۔ تحریر فرماتے ہیں۔ اگر ترجیح و انتخاب شوریٰ کا کام ہو تو ہر رائے دہندہ اپنی ہی

---

[۱] فطری حکومت حصہ دوم ص ۶۴ تا ۶۶ ملخصاً مطبوعہ ادارہ تاج المعارف دیوبند ۱۹۶۳ء

رائے کو مرجح قرار دیگا اور اس ترجیح کے اختلاف کے لئے پھر کسی مرجح کی ضرورت پیدا ہو جائے گی اور تسلسل کی سی صورت بن جائے گی پس جو مبتلائے اختلاف آراء ہے وہ خود مرجح آراء نہیں ہونا چاہئے۔ . . . .
اس لئے عدد و دلائل میں رہ کر فیصلہ ترجیح امیر کے ہاتھ میں ہونا ناگزیر تھا نہ کہ شوریٰ کے ہاتھ میں، نیز جو حکم میں مشورہ دے گا وہی مشورہ قبول بھی کرے گا . . . .
اس لئے عقلاً بھی قبول کنندہ کو ترجیح و انتخاب رائے کا حق ہونا چاہئے، پس یہ امیر ہی کا کام ہوگا کہ وہ مشوروں کی شقوق وجوانب میں سے موزوں ترین جانب اور اصلح ترین شق کا انتخاب کرے۔" ۵۱

بہرحال مشوری میں نہ یہ ضروری ہے کہ محض کثرت رائے کا اعتبار کیا جائے اور نہ یہ بات ہے کہ امیر کسی ایک رائے کا پابند ہو جائے۔ بلکہ اگر اس کے نزدیک کم لوگوں کی رائے صائب ہو تو اسی پر عمل کرے جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عام صحابہ کے مقابلہ میں حضرت شیخین کی رائے پر کبھی عمل فرما لیتے تھے۔ چنانچہ آپ نے دونوں کے لئے فرمایا۔ اخرج الامام احمد عن عبد الرحمٰن بن غنم ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال لابی بکر و عمر لو اجتمعتما فی مشورۃ ما خالفتکما (آپ نے سیدنا ابوبکر و عمر فاروق رضی اللہ عنہما سے فرمایا کہ تم دونوں اگر ایک ہی مشورے پر متفق ہو جاتے ہو تو میں اس کی مخالفت نہیں کرتا)

ارباب حکومت کا کام محض تنفیذ قانون ہے

اس کے علاوہ قانون صرف اللہ تعالیٰ کے حکم کا نام ہے خواہ اس کے اپنے لفظوں میں نازل ہوا ہو یا اس کے رسول کے واسطے سے معانی کا نزول ہوا ہو اور الفاظ رسول کے ہوں۔ جس کا مطلب یہ ہے

---

۵۱ فطری حکومت جلد دوم صہ ۶۳

کہ قانون ساز اللہ تعالیٰ ہیں باقی خلیفہ اور امیر کی ذمہ داری صرف نفاذِ قانون کی ہے۔

اس کے برعکس جس طرح شہنشاہیت اسلام کے خلاف ہے کہ اس میں قانون سازی اور نفاذِ قانون دونوں کا حق فردِ واحد یعنی بادشاہ کو حاصل ہوتا ہے۔ اسی طرح جمہوریت بھی اسلام سے متصادم ہے کیونکہ اس میں قانون سازی کا حق عوام کو ملتا ہے جس کی تکمیل اس کے منتخب نمائندوں کے ذریعے پالیمنٹ میں ہوتی ہے۔

اس تفصیل کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام اور جمہوریت میں بونِ بعید ہے۔ اس قدر طویل و عریض فرق کے باوجود پھر جمہوریت کا رشتہ اسلام سے بلکہ اسلام کا رشتہ جمہوریت سے جوڑنے کی جسارت کیسے کیجاتی ہے؟ سوائے اس کے کہ مظلوم اسلام پر کی گئی بہت سی ستم فرسائیوں میں سے ایک یہ بھی ہے۔ تاکہ دائرۂ حکومت میں صحیح اسلامی نظام کے قیام کے مطالبہ سے کم از کم اس دنیا میں تو خود چھٹکارا دلا سکتی۔

اسلام اور سوشلزم

افسوس کہ اسی طرح کی ایک اور جسارت یہ کی جانے لگی ہے کہ اسلام کے ساتھ سوشلزم کا پیوند لگایا جا رہا ہے۔ حالانکہ سوشلزم جس مسئلہ کو حل کرنے کے لئے معرضِ وجود میں آیا ہے۔ یعنی روٹی اور کپڑا، اسلام کے نزدیک وہ کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔ کیونکہ اس کے نزدیک اس مسئلہ کی اصل حقیقت یہ ہے کہ رزق کا تمام تر تعلق اللہ تعالیٰ کے فیصلہ اور تقدیر سے ہے قرآن پاک کی بہت سی آیات اور متعدد روایات حدیث اسی پر شاہد ہیں۔ پھر بھی ایسا نہیں ہے کہ اسباب کے درجہ میں اس نے اس باب میں کوئی ہدایت نہ دی ہو۔ ہدایت دی اور نہایت مفید ہدایت دی۔ ایک طرف تو اس نے توکل اور قناعت کی پرزور تعلیم دی۔ جبکہ سب سے زیادہ خرابی فسادِ معاشرہ اور بدامنی تک نوبت ان ہی دو اخلاقی قدروں سے محرومی کی وجہ

سے پہونچتی ہے دوسری طرف اس نے کسب اور محنت کو خدا اور رسول کے نزدیک نہایت پسندیدہ عمل اور اس سے غفلت کو ایک مجرمانہ فعل قرار دیا۔

اور عجیب تر بات یہ ہے کہ روٹی کی پریشانی کو ایک مرض قرار دیکر سوشلزم نے جو اس کا علاج تجویز کیا وہ خود مستقل مرض سے کم نہیں، بلکہ اس نے تکلیفوں میں مزید اضافہ کر دیا۔ کیونکہ سوشلزم نے جس سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف علم بلند کیا تھا اس کا نقطۂ نظر تو یہ ہے کہ غریبوں کی تعداد گھٹے اور مالداروں میں اضافہ ہو، اور مالداروں میں ہی نہیں بلکہ مالداروں کی مالداری میں بھی زیادتی ہو، خواہ اس کی کوئی بھی تدبیر ہو، مگر ظاہر ہے کہ اس نقطۂ نظر کی کامیابی کے لئے جب جائز ناجائز اور حق ناحق کی تمیز باقی نہیں رہے گی تو سماج کیسے سدھر سکتا ہے، معاشرہ اخلاقی قدروں سے محروم ہی ہوگا۔ اور وہی ہوا۔ اس کے بعد سوشلزم نے یہ کیا کہ مالداروں کو ان کی سطح سے کھینچکر غریبوں کی صف میں لا کھڑا کیا۔ ان کو ان کی ملکیتوں اور ان کے منافع سے محروم کیا، نتیجہ یہ ہوا اور ہو رہا ہے کہ جو بے صلاحیت تھے وہ تو بڑھ نہ سکے جوں کے توں رہے، جو کچھ مالداروں سے چھین کر دیا۔ اس کو بھی ضائع کر دیا۔ اور جو مالدار سے غریب بن گئے ان کے دل و دماغ میں ان اصلی غریبوں اور جنہوں نے ان کو تہیدست کیا ان کی طرف سے شدید بغض و نفرت پیدا ہو گئی۔ اور ظاہر ہے کہ یہ بات بھی ملک اور سماج کے لئے تباہ کن ہی ہے۔

اقتصادیات میں اسلام کا فطری نظام

اسلام نے یہ معتدل اور فطری راہ اختیار کی کہ دولت کی تقسیم میں عدل ہونا چاہئے اور عدل کے معنی یہ ہیں کہ کسی فرد کو اس کی جائز ملکیت اور اس کے جائز منافع سے ہرگز محروم نہ کیا جائے۔ اس لئے کہ یہ دونوں چیزیں اس کی صلاحیت کی مظہر ہیں، لیکن جو کسی بھی وجہ سے محتاج اور تہیدست ہیں ان کا جزوی حصہ جو ان کی ناگذیر ضرورتوں کے لئے کافی ہو سکے مالداروں کے زائد از ضرورت

اور اضافہ پذیر اموال میں مقرر کر دیا ——— اور اس کو محض معاشرتی مسئلہ نہیں قرار دیا، بلکہ مذہب کا اہم فریضہ بنا کر اس کے تارک کو نہایت المناک سزا کا مستحق قرار دیا ——— ذرا سوچئے کہاں مساوات کا غیر فطری نعرہ اور اس کے لئے نامعقول جد وجہد اور کہاں عدل کا وہ فطری نظام جو اپنے ساتھ عملی کامیابی کی زبردست تاریخ رکھتا ہے۔

سوشلسٹ مسلمان | اس صورت میں بھلا کیسے سوشلزم کو اسلام سے منسلک کیا جا سکتا ہے، بعض لوگ جب اسی واضح فرق کو ختم کرنے سے عاجز ہو گئے تو اپنی دانست میں ایک نہایت منصفانہ بات کہی۔ کہ ہمارا مذہب بیشک اسلام ہے، اور اسی کی نسبت سے ہم مسلمان ہی ہیں لیکن اقتصادیات کے معاملہ میں ہم سوشلسٹ ہیں ان کی اس بات کے دو ہی مطلب ہو سکتے ہیں ایک تو یہ کہ اقتصادی معاملہ میں ہم کسی بھی نظریہ اور کسی بھی نظام عمل کو اختیار کرنے میں آزاد ہیں، اسلام کا ہمارے اس خالص دنیاوی مسئلہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اور دوسرے یہ کہ اسلام نے اقتصادیات کے سلسلہ میں جو نظام پیش کیا ہے وہ چونکہ اس دور میں ناکام ہے اس لئے ہم نئے نظام سوشلزم کو اپنا رہے ہیں۔

معلوم نہیں ان دونوں میں سے ان کا اپنا مطلب کونسا ہے۔ اور کیا وہ اس کی سنگینی سے باخبر بھی ہیں یا نہیں؟ تاہم ایسوں کے لئے قرآن حکیم کا یہ واضح خطاب موجود ہے۔

(۱) يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُبِينٌ - فَإِنْ زَلَلْتُمْ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْكُمُ الْبَيِّنَاتُ فَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ

اے ایمان والو اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ اور (فاسد خیالات میں پڑ کر) شیطان کے قدم بقدم مت چلو واقعی وہ تمہارا کھلا دشمن ہے، پھر اگر تم بعد اس کے کہ تم کو واضح دلیلیں پہونچ

عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ ۔ (القرآن - البقرہ)

چکی ہے صراط مستقیم سے لغزش کرنے لگو تو یقین کر رکھو کہ حق تعالیٰ بڑے زبردست ہیں حکمت والے ہیں (ترجمہ حضرت تھانوی)

(۲) اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْفُرُوْنَ بِاللّٰہِ وَرُسُلِہٖ وَیُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّفَرِّقُوْا بَیْنَ اللّٰہِ وَرُسُلِہٖ وَیَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَکْفُرُ بِبَعْضٍ وَّیُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّتَّخِذُوْا بَیْنَ ذٰلِکَ سَبِیْلًا اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْکٰفِرُوْنَ حَقًّا وَاَعْتَدْنَا لِلْکٰفِرِیْنَ عَذَابًا مُّھِیْنًا

(القرآن - النساء)

جو لوگ کفر کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کے ساتھ اور اس کے رسولوں کے ساتھ اور یوں چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے اور اس کے رسولوں کے درمیان فرق رکھیں اور کہتے ہیں کہ ہم بعضوں پر تو ایمان لاتے ہیں اور بعضوں کے منکر ہیں۔ اور یوں چاہتے ہیں بین بین ایک راہ تجویز کریں۔ ایسے لوگ یقیناً کافر ہیں اور کافروں کے لئے ہم نے اہانت آمیز سزا تیار کر رکھی ہے۔ (ایضاً)

مسئلہ انتخاب اور دو مفکرین کی تحقیقات

بہر حال اسلام سے جمہوریت یا مثل جمہوریت کا جو رشتہ جوڑا گیا اس کا حشر تو دیکھ لیا۔ اب اس بنیاد پر انتخاب امیر اور خلفاء راشدین کو چننے جانیکے طریق کار کی جو تعبیر کی ہے اس کو بھی ملاحظہ فرمالیجئے۔ ڈاکٹر طٰہٰ حسین لکھتے ہیں۔

"نیز یہ بات بھی نہایت اہم ہے کہ خلافت کی اساس بیعت پر قائم ہے یعنی عوام اور جمہور کی مرضی پر اس کا مطلب یہ ہوا کہ خلافت امیر اور عوام کے مابین ایک معاہدہ جو ایک طرف خلفاء کو اس بات کا پابند بناتا ہے کہ وہ اہل ملک پر حق و انصاف کے ساتھ حکومت کرینگے ان کے مصالح کی رعایت اور معاملات میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت

پاک پر عمل کریں گے۔ اور دوسری طرف مسلمانوں پر یہ ذمہ داری عائد کرتا ہے کہ وہ امیر کی اطاعت اور اس کے ساتھ خیر خواہی اور مدد کا معاملہ کریں گے۔

لہذا کسی خلیفہ کو اس بات کا حق نہیں ہے کہ وہ اپنی امارت اور حکمرانی مسلمانوں پر اپنی طرف سے تھوپ دے" (الفتنۃ الکبریٰ)

اسی طرح ایک دوسرا حوالہ ملاحظہ ہو۔ محترم مولانا حامد الانصاری غازی صاحب اپنی کتاب "اسلام کا نظام حکومت" میں لکھتے ہیں۔

"اسلامی حکومت میں ریاست عامہ کے رئیس عام کا تقرر کسی ایک قانونی اصول اور سیاسی حکم کا پابند نہیں ہے"۔۔۔۔ اس کا تقرر ایک عام انتخابی مہم ہے جس کے لئے چند قانونی اصول اور ایک سے زیادہ صورتیں اور شرطیں متعین ہیں۔ جن میں سے ہر اصول۔ ہر شرط ہر صورت اور ہر قانون و ضابطہ دین کے تحفظ کے بعد مرضئ عامہ رائے عامہ اور اجماع امت کے تابع ہے۔ نظام حکومت ص ۳۶۲

اس کے بعد مولف موصوف نے ہر ایک خلیفۂ راشد کے انعقادِ خلافت کے بیان میں بیعت عامہ کو اس طرح بنیادی اہمیت دی کہ گویا خلافت کا تحقیق بیعت عامہ کی بنا پر ہوا، مثلاً حضرت صدیق اکبر کے تذکرہ میں تحریر فرمایا۔

"جمہور امت شوریٰ کے کھلے اجلاس میں جمع ہو کر صاف اور تیز رفتار بحث کرتے ہیں اور نتیجہ کے طور پر ایک شخص پر جمع ہو جاتے ہیں امت کی مرضی اجماع کی شکل اختیار کر لیتی ہے امت کا فیصلہ افراد کے ارادوں اور جماعتوں کے رجحانات پر غالب آجاتا ہے ایک شخص ہیئت اجتماعی کا قائد و امام تسلیم کر لیا جاتا ہے اس کے

نام پر بیعت کر لی جاتی ہے۔" (۱)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں لکھا ہے۔

"اس صورت میں خلیفہ وقت اپنے جانشین کا نام تجویز کرتا ہے، تجویز نام اہل حل وعقد کے شوریٰ میں آتا ہے اس کے بعد مرضی عامہ حاصل کرنے کے لئے پیش ہوتا ہے اور جب یہ تینوں مرحلے گذر جاتے ہیں تو مجوزہ شخص اپنے عہدے پر آجاتا ہے۔" (۲)

اب آپ ان تعبیرات کو حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہٗ کی گذشتہ اوراق میں نقل کردہ تعبیرات سے موازنہ کیجئے اور دیکھئے کتنا فرق ہے اور ایک تاریخی بات کی نوعیت کس طرح بدل جاتی ہے ——— واقعہ یہ ہے کہ اپنے دور کے رجحانات سے خود کو بچا کر لے چلنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ ہمارے دل میں ڈاکٹر طٰہٰ حسین اور مولانا غازی صاحب دونوں کا حد درجہ احترام ہے اور ان کی ذہانت وفطانت اور وسعتِ علم کا بھرپور اعتراف کرتے ہیں۔ لیکن چوں کہ یہ مسئلہ علمی اور تاریخی ہے اس لئے اگر ہمارا ذہن ان دونوں بزرگوں کے نظریہ سے میل نہ کھائے تو اس سے احترام پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ کیونکہ اختلافِ نظریہ سے ہے نہ کہ شخصیات سے۔ اور اس طرح کا اختلاف تو استاد شاگرد کے درمیان بھی جائز ہے۔

بیعت کے معنی | اس سلسلہ میں ایک بات تو یہ دیکھنی ہے کہ بیعت کے معنی کیا ہیں ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے اس کے معنیٰ معاہدہ کے لئے ہیں۔ یعنی بیعت اس معاہدہ کا نام ہے جو حاکم اور محکوم کے درمیان ہو۔ کہ دونوں ایک دوسرے سے متعلق اپنے فرائض کی انجام دہی کا عہد کرتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ بیعت کے معنیٰ معاہدہ ہونا لغت عرب کی کتابوں میں ہے۔ لیکن میں پوچھتا ہوں کہ کیا پیغمبر سے یا اللہ سے بھی بیعت کے یہی معنیٰ ہوں گے۔ آیت قرآنی۔

---

(۱) اسلام کا نظام حکومت ص ۳۶۴ (۲) ایضاً صفحہ مذکور۔

ان الذین یبایعونك انما یبایعون اللہ (الفتح) — جن لوگوں نے آپ سے بیعت کی ہے دراصل انھوں نے اللہ سے بیعت لی ہے۔

یں معاہدہ کی آخر کیا نوعیت ہے ؟

ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ بیعت کے معنیٰ وعدۂ اطاعت و وفاداری کے ہیں - اور یہ معنیٰ بھی لغت میں موجود ہیں -

والبیعۃ المبایعہ · الطاعۃ [1] — اور بیعت کے معنی مبایعت (باہمی معاملہ اور عہد کرنے) اور طاعت و فرمانبرداری کرنا ہے

بیعت کے یہ معنیٰ ہر جگہ منطبق ہوتے چلے جائیں گے - خواہ اللہ تعالیٰ کے رسول سے ۔ امیر اور خلیفہ سے ہو یا کسی عالم اور شیخ طریقت سے ۔

ہاں اس صورت میں یہ لازمی طور پر ماننا پڑے گا کہ خلیفہ کی خلافت کا تحقق پہلے ہو چکا ہے ، تب ہی اس سے وعدۂ وفاداری بصورت بیعت کیا جا رہا ہے -

بیعت بمعنی معاہدہ کی غلطی

اور اگر یہ مان لیا جائے کہ بیعت کے معنیٰ معاہدہ کے ہی ہیں تو سوال یہ ہے کہ اس معاہدہ کا انعقاد تحقق خلافت سے پہلے ہے یا بعد ؟ اگر اسی سوال کی مزید وضاحت مطلوب ہے تو سنئے معاہدہ کی دو ہی نوعیتیں ہیں اور ہو سکتی ہیں -

(۱) کچھ لوگ (خواہ ہزار ہوں یا لاکھ) ایک شخص سے یہ کہیں کہ اگر آپ خلیفہ بن گئے تو ہم آپ کی اطاعت بھی کریں گے اور نصرت بھی لیکن آپ کو بھی ہمارے ساتھ یہ یہ معاملہ کرنا ہوگا - وہ شخص یقین دلاتا ہے کہ میں ضرور تمہیں یہ سہولتیں بہم پہونچاؤنگا -

(۲) کچھ لوگ (خواہ ہزاہ ہوں یا لاکھ) ایک شخص سے یہ کہیں کہ آپ اس ملک کے حاکم

---

(۱) لسان العرب جلد نہم -

اور خلیفہ ہیں - ہم آپ کو آپ سے اطاعت کا اور نصرت کا عہد کرتے ہیں۔ لیکن آپ بھی وعدہ کیجئے کہ ہماری ان ان ضرورتوں کو پورا کریں گے۔ وہ شخص اس کا وعدہ کر لیتا ہے ظاہر ہے کہ ان دونوں صورتوں کے علاوہ تیسری کوئی صورت معاہدہ کی نہیں ہو سکتی لہذا اب بتایا جائے کہ بیعت مذکورہ میں معاہدہ کی کونسی صورت ہے ؟ جو بھی صورت لیجائے اس کا تعلق تحقق خلافت سے کچھ بھی نہ ہوگا۔ کیونکہ پہلی صورت میں بوقت بیعت خلافت کا وجود نہیں تھا۔ اور دوسری صورت میں بیعت سے پہلے خلافت کا انعقاد ہو چکا ہے

بیعت کی انعقاد خلافت سے بے تعلقی

اس لئے ماننا پڑے گا کہ بیعت عامہ کا تحقق و انعقاد خلافت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہاں بعد خلافت سے ہے۔ جس کی صورت یہ ہے۔ کہ ایک اہل اور شرائطِ خلافت کے حامل شخص کے روبرو قبول خلافت کا مرحلہ آتا ہے۔ خواہ خلیفہ کی وفات یا معزولی کیوجہ سے از خود یا کسی ایک فرد یا چند افراد کی طرف سے پیشکش کی بنا پر۔ اور وہ شخص اس خلافت کی ذمہ داری کو اور اس کے منصب کو قبول کر لیتا ہے اس قبولیت کا نام تحقق خلافت ہے۔ اس کا اعلان (کسی بھی صورت سے) ہوتا ہے اور لوگ بیعت کی صورت میں اظہار وفاداری کرتے ہیں۔

خلفاء راشدین کی ترتیب اور فرمان پیغمبری

میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ دور نبوت سے ہی یہ بات متعین تھی کہ پہلے خلیفہ حضرت صدیق اکبر۔ اور دوسرے حضرت فاروق اعظم، تیسرے حضرت عثمان غنی۔ اور چوتھے حضرت علی رضی اللہ عنہم اجمعین ہوں گے۔ اس کے ثبوت کے لئے درج ذیل سطور قابل توجہ ہیں

الامام الفقیہ ابو محمد عبداللہ بن مسلم ابن قتیبہ الدینوری نے حضرت عبداللہ بن مبارک رح کی ایک روایت نقل کی ہے۔

قال اخبرنا محمد بن الزبیر قال ارسلنی ابن مبارک نے کہا کہ ہم کو محمد بن زبیر نے

عمر بن عبد العزیز الی الحسن البصری رحمۃ اللہ تعالیٰ اسالہ ان کان رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم استخلف ابوبکر رضی اللہ عنہ فاتیتہ فاستوی جالسا وقال ای والذی لا الٰہ الا ھو استخلفہ وھو کان اعلم باللہ تعالیٰ واتقی للہ تعالیٰ من ان یتوثب علیھم لولم یامرہ [1]

خبر دی کہ مجھے حضرت عمر بن عبد العزیز نے حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کی خدمت میں بھیجا تاکہ میں دریافت کروں کہ کیا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنایا تھا۔ میں حضرت حسن بصری کے پاس آیا اور پوچھا، تو وہ سیدھے ہو کر بیٹھ گئے اور (جواب میں یہ) کہا کہ قسم ہے اس ذات کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں آپؐ نے ان کو خلیفہ بنایا تھا۔ اور حضرت ابوبکر بڑے عالم ربانی ہونے کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے سب سے زیادہ ڈرنے والے بھی تھے۔ لہٰذا اگر ان کو اس امر کا حکم نہ دیا گیا ہوتا تو وہ ہرگز لوگوں پر مسلط نہ ہوتے۔

اسی طرح مشہور حدیث ہے کہ مرضِ وفات میں جب نماز کا وقت آیا تو آپ نے امامت کی غرض سے جس کو جن الفاظ سے طلب فرمایا ان سے سب نے یہ سمجھا کہ حضرت ابوبکر صدیق رضؓ مطلوب ہیں اور اہل فہم نے یہ بھی سمجھ لیا تھا کہ اس وقت کی سپردگی امامت کوئی وقتی اور معمولی بات نہیں ہے۔ بلکہ اسی راستہ سے مستقبل کے لئے خلیفہ سازی بھی مطلوب ہے، تو حضرت عائشہؓ نے یہ سمجھکر کہ یہ بڑے جھمیلے کا کام ہے حضرت ابوبکر

---

(۱) الامامۃ والسیاسۃ ط۲ لابن قتیبۃ المذکور م ۲۷۶

کو اس میں مبتلا ہونے سے بچایا جائے۔ تو چاہا کہ یہ بات حضرت عمرؓ کی طرف منتقل ہو جائے۔ مگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر جو ارشاد فرمایا تھا اس کو ملاحظہ کیجئے۔

فقال صلی اللہ علیہ وسلم انکن صواحبات یوسف علیہ السلام اُدْعُوْنَ لی حبیبی انما افعل ما اومر [1]

تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم تو حضرت یوسف علیہ السلام (کے قصہ والی) عورتیں ہو میرے پاس میرے حبیب کو بلاؤ میں وہی کروں گا جس کا مجھے حکم دیا گیا ہے۔

کیا اس سے یہی نہیں ثابت ہوتا کہ آنحضرتؐ نے باصرار ابوبکر صدیقؓ کو یہ امامت اسی لئے سپرد فرمائی کہ یہ خلافت کا پیش خیمہ تھی جو پہلے سے متعین و مقدر ہو چکی تھی اور اس مقصد کو سمجھکر ہی حضرت عائشہؓ نے ٹالنا چاہا تھا۔ اور پھر اسی لئے بوقت بیعتِ خلافت حضرت عمر فاروقؓ نے یہ جملہ کہا تھا۔

"رائے ابوبکر کیا کسی کو یہ بات زیب دے گی کہ وہ تم سے اوپر ہو۔ تم غار کے ساتھی دو میں کے ایک ہو۔ اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے تم کو نماز کی امامت کا حکم دیا تھا اس لئے اس منصبِ خلافت کے تم ہی اہل ہو" [2]

ثقیفہ بنی ساعدہ اور شیخینؓ

میں کہتا ہوں کہ اگر یہ سب نہیں تھا تو ثقیفہ بنی ساعدہ کے ہنگامہ خیز بحث و مباحثہ میں حضرت ابوبکرؓ نے کیوں جا کر دخل اندازی کی تھی۔ اور فخر جامسر عین [3] کے الفاظ میں کہ جیسے ہی وہاں مجمع انصار کے بیچ درپیش مسئلہ خلافت اور حضرت سعد بن عبادہ کی تقریر کی اطلاع حضرت صدیق اکبرؓ کو ہوئی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ہمراہ لیا۔ اور دونوں تیزی کے ساتھ وہاں جانے کے لئے نکل کھڑے ہوئے۔

---

(۱) الامامۃ والسیاستہ ص۳ (۲) ایضاً ص۶ (۳) ایضاً ص۵

اور پھر وہاں پہونچکر اپنے دلائل سے ان سب کو دبا لیا، یہ آخر کیوں ہوا۔ کیا اس لئے کہ حضرت صدیق اکبرؓ از خود حاکمِ عرب بننے کے آرزومند تھے، کیا امت میں سب سے بلند رتبہ، بلکہ پیغمبرؐ کے بعد دوسرے نمبر کی شخصیت، جس کے زہد و تقویٰ اور شانِ استغنار اور رد دنیا اور امور دنیا سے بے رغبتی چار دانگ عالم میں مشہور ہے اس سے اس بات کی توقع کی جا سکتی ہے، اور اگر معاملہ کی نوعیت یہی تھی تو کیا تمام صحابہ مہاجرین و انصار کے مجمع پر جادو کر دیا تھا کہ زوردار بحث کے باوجود پھر ان سب نے گردنیں جھکا دیں اور سب نے صدیق اکبرؓ کی خلافت کو بلا چون و چرا تسلیم کر لیا۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ یہ سب بغیر اس حقیقت کے سامنے آئے ہو گیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خلافت کے لئے پہلے ہی سے صدیق اکبرؓ کی ذات متعین شدہ ہے

ہاں چوں کہ کوئی مسئلہ شرعیہ فقہیہ نہیں تھا۔ اس لئے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے صراحتًہ اور باقاعدہ نامزدگی نہیں فرمائی تھی اور غالباً بوقت شدتِ مرض کرنی چاہی تو اللہ تعالیٰ کو منظور نہیں ہوا کہ ایسا ہو۔ کیونکہ شاید اگر ایسا ہو جاتا، تو قیامت تک کے لئے اس میں وراثت و ولیعہدی متعین ہو جاتی۔ اور نظام انتخاب کا اصول ہی مختل ہو کر رہ جاتا۔ اس لئے آپ نے اشارۃً ہی اپنے منشا کی اور فیصلہ کی اطلاع دی ہو گی۔ اور اسی وجہ سے سوائے چند مخصوصین کے تمام صحابہؓ اس سے باخبر نہ ہو سکے اسی لئے سقیفۂ بنی ساعدہ میں بحث کھڑی ہو گئی۔ لیکن جیسے ہی حقیقت واضح ہوئی تو وہ بحث بھی ختم ہو گئی۔

اسی طرح یہ حدیث بھی ملاحظہ کیجائے۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آج رات
اُری اللیلۃ رجل صالح کان ابابکر نیط	مجھکو دکھلایا گیا کہ ایک مرد صالح اور حاصل خواب
برسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم و نیط عمر بابی بکر	یہ تھا کہ گویا کہ ابو بکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

ونیط عثمان بعمر قال جابر فلما قمنا من عند رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قلنا اما الرجل الصالح فرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واما نوط بعضهم ببعض فهم ولاۃ الامر الذی بعث اللہ به نبیه صلی اللہ علیه وسلم ؎

کے نائب بنائے گئے۔ اور عمر ابوبکر کے نائب بنائے گئے اور پھر عثمان عمر رضی اللہ عنہم کے نائب بنائے گئے۔ حضرت جابر رض راوی فرماتے ہیں کہ جب ہم آپ کے پاس سے اٹھ کر گئے تو ہم نے آپس میں کہا کہ رجل صالح تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور یہ جو ایک دوسرے کے نائب ہوئے ہیں۔ یہ اسی معاملہ کے والی اور ذمہ دار ہیں جس کے لئے نبی صلے اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے مبعوث فرمایا ہے۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے اور ان کے بقول سب حاضرین نے مذکورہ بات کی نوعیت کو اسی لئے سمجھا تھا کہ وہ پیغمبر کے خواب کی حقیقت سے باخبر تھے۔

اس حدیث میں بالترتیب تینوں حضرات خلفاء راشدین کا تذکرہ ہے میں پوچھتا ہوں کہ یہ اور اس طرح کی متعدد روایات کا محمل آج سب یہی سمجھتے ہیں کہ خلفاء اربعہ کی خلافت کی نشاندہی کی گئی ہے، سوال یہ ہے کہ کیا اسی طرح ان حضرات صحابہؓ نے نہ سمجھا ہوگا۔ جن کے سامنے یہ حدیثیں آپ نے بیان فرمائی ہوں گی۔ یا بعد میں ان تک پہونچی ہوں گی ؟

باقی

گذارش

خط وکتابت کرتے وقت اپنے رسالہ کی چِٹ نمبر کا حوالہ ضرور دیدیا کریں

(مینجر برہان)

؎ مشکوٰۃ شریف کتاب المناقب ص۵۶۳ (مطبوعہ رشیدیہ دہلی)